خصوصی مضمون:

ڈاکٹر انجم پروین
Fareed Gunj, Omri Kalan, Muradadabad, UP
anjumparveen1491@gmail.com

رسالہ تاریخ ادب اردو: ایک تنقیدی جائزہ

(جلد3-شمارہ 1۔ جنوری تا مارچ 2021)

ادب چاہے اردو زبان کا ہو یا کسی بھی زبان کا اور خواہ کسی بھی قسم کا ہو، اس کی ترویج و اشاعت اور عوام سے متعارف کرانے کا عام وسیلہ رسائل و جرائد ہی ہوتے ہیں۔ لہذا اردو زبان کو عوامی اور مقبول بنانے میں رسائل کا خاص رول رہا ہے۔ ان رسائل نے اردو کی نہ صرف ملکی سطح پر آبیاری کی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اردو کو پروان چڑھانے اور پھلنے پھولنے کے بہترین مواقع فراہم کیے ہیں۔ رسالہ ''تاریخ ادب اردو'' اس ضمن میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

رسالہ ''تاریخ ادب اردو'' دہلی سے نکلنے والا ایک بین الاقوامی پیر ریویو ریفریڈ جرنل ہے اور یو جی سی کیئر لسٹیڈ کے زمرے میں شامل ہے۔ 2019 میں اس کی اشاعت اول منظر عام پر آئی۔ بہت جلد اس جریدے نے نہ صرف ادبی حلقوں میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہ ایک ادبی جرنل ہے، جس میں تمام علوم وفنون پر محیط مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔ اس جریدہ کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں معروف شخصیات اور قلم کاروں کے علاوہ علاقائی تعصّبات سے بالاتر ہو کر نوقلم اور نوجوانوں کو اپنے خیالات کے اظہار اور ادبی ذوق کی تکمیل کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اس رسالے میں ادب سے متعلق تنقیدی، تحقیقی، معلوماتی اور نئے رجحانات و افکار سے لیس معیاری اور حوالہ جاتی مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جو قارئین کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ جرنل اپنے قارئین کو کلاسیکی و جدید ادب سے روشناس کرنے کے ساتھ ساتھ اردو دنیا میں واقع ہونے والی

تبدیلیوں اور نئے فکری رجحانات سے واقفیت بھی عطا کرتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس جرنل کا شمار اردو کے ان اہم اور معیاری جرنلز میں ہونے لگا جو بین العلومی موضوعات مثلاً: آرٹ، فلسفہ، مذہبی وثقافتی علوم، تاریخ، زبان وادب، فلم ومیڈیا اسٹڈیز اور بشری علوم کی اشاعت پر مشتمل ہوتے ہیں۔

رسالہ تاریخ ادب اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم کی رہنمائی میں نکلتا ہے۔ پروفیسر ارتضی کریم کا نام اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ یہ ایک طویل عرصے سے اردو تنقید کے میدان میں بہت فعال اور متحرک ہیں۔ یہ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور صدر شعبۂ اردو کا فریضہ بھی انجام دے چکے ہیں۔ نیز قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ ڈائریکٹر کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی ترویج واشاعت میں متعدد کام کیے ہیں اور اردو کی بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کی کامیابی میں پروفیسر ارتضی کریم کا خاص رول رہا ہے۔ ان کی اردو سے محبت، جدوجہد ولگن کا اعتراف کرتے ہوئے اس رسالے کے مدیر پروفیسر محمد یحییٰ صبا اپنے ایک اداریہ میں لکھتے ہیں:

> پروفیسر ارتضی کریم کی رہنمائی میں ہمارا رسالہ صف اول میں شمار ہونے لگا ہے۔ ان کی اردو زبان وادب سے والہانہ محبت کی وجہ سے رسالے کی زبان میں نکھار آرہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے قارئین پروفیسر ارتضی کریم کی رہنمائی میں نکلنے والے اس رسالے سے مستفید ہوں گے اور اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کریں گے۔"

(تاریخ ادب اردو، جلد۔3، شمارہ: 4، اکتوبر تا دسمبر 2021، ص: 5)

پروفیسر ارتضی کریم نے رسالہ "تاریخ ادب اردو" کو یوجی سی کیئر لسٹ میں شامل کرنے کے لیے بہت کوشش کی اور آج نتیجہ آپ سب کے سامنے ہے۔ پروفیسر ارتضی کریم کو اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب پر دسترس حاصل ہے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں "اردو فکشن کی تنقید"، "موضوعات"، "مطالعات"، "مابعد جدیدیت اور پریم چند"، "آغا حشر عہد اور ادب"، "قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ"، "انتظار حسین ایک دبستان"، "اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے"، "جدید تنقید کا منظر نامہ"، "اردو میں پاپولر لٹریچر" اور "اردو افسانے میں بیانیہ کا احیا" خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر ارتضی کریم کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

نگراں اور سرپرست کے علاوہ کسی بھی ادبی جریدے کو کامیابی کے مراحل طے کرانے میں مدیر کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔"تاریخ ادب اردو" کے مدیر پروفیسر محمد یحییٰ صبا ہیں۔ان کا شمار اردو کے فعال اور محنتی ادیب و محقق میں ہوتا ہے۔پروفیسر یحییٰ صبا کی قابلیت و لیاقت نے اس رسالے کے معیار کو بلند کرکے موقر رسائل کی صف میں شامل کر دیا۔ان کی اس علمی و ادبی کاوش کو بیشتر قارئین نے سراہا ہے اور ادبی حلقوں میں وہ داد تحسین بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پروفیسر یحییٰ صبا دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو میں بطور پروفیسر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ان کا تعلق صوبۂ بہار کے اررِیہ ضلع میں جوکی بلاک کے مہدیوا گاؤں سے ہے۔انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے کسب فیض کیا اور پھر یہیں بطور مدرس ملازمت اختیار کی ۔اب تک ان کی تقریباً چھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن کے نام ہیں:" آغا شاعر کی ناول نگاری"،"ادبی شخصیات"،"ادبی مقالات"،"ادبی تجزیات"،"ادبی مناظرات"اور"جمیل جالبی:محقق و مورخ"ان کتابوں سے قطع نظر ان کے ادبی و تنقیدی نوعیت کے مضامین اردو کے بلند پایہ اور موقر رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔نہ صرف دیگر رسائل میں بلکہ رسالہ" تاریخ ادب اردو" کے تقریباً ہر شمارے میں پروفیسر یحییٰ صبا کے متنوع موضوعات پر مشتمل مضامین باقاعدگی سے شائع ہوتے رہیں۔مثال کے طور پر:"ایک تبسم آفریں قلم کار خالد محمود"،"فرحت روح کا شاعر:اصغر گونڈوی"،"سماجی درد کا شاعر:زبیر الحسن غافل"،"ناصر ملک:رنگین دنیا کا ایک گمنام شاعر"،"رینو کی کہانیوں میں مٹی کی خوشبو" وغیرہ۔ان کی تحریروں کے مطالعہ سے آشکار ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے جن پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ان کی تحریریں با مقصد ،گہری فکر اور عمیق مطالعے کی نشاندہی کرتی ہیں۔ان کا انداز بیان مبہم، بوجھل اور ثقیل الفاظ سے عاری سلیس و رواں ہے، جس کی قرات ایک ادنیٰ قاری بھی باسانی کر سکتا ہے۔حقانی القاسمی اپنی کتاب "رینو کے شہر میں" پروفیسر یحییٰ صبا کی تحریر پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> یحییٰ صبا کی تحریر میں ابہام یا اہمال نہیں ہے بلکہ فطری سادگی اور سلاست ہے۔ان کے ذہن میں جو جذبات، خیالات موجزن ہوتے ہیں انہیں بغیر کسی تصنع اور تکلف کے پیش کر دیتے ہیں۔اضاحت اور سادگی کے اعتبار سے ان کی تحریں آج کے ان ارسطوؤں سے الگ ہیں جو لسانی اور فکری کنفیوژن یا کنورژن کے شکار ہیں اور جن کے لیے خود اپنی تحریر کی تفہیم بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔یحییٰ صبا میں جذب و انجذاب

کی قوت ہے۔ان کی ہر تحریر پران کی اپنی زبان کا اثر نظر آتا ہے،کسی اور تحریر کا گمان
نہیں گزرتا۔جبکہ آج کے دور کی بیشتر تنقیدیں ارسطو،افلاطون،ایلیٹ کی تحریر کردہ
نظر آتی ہیں۔یحیٰ صبا نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ مانگے کے
اجالے سے اپنی سوچ اور اپنی زبان زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

(رینو کے شہر میں از حقانی القاسمی،ص: 225،اشاعت :2007۔ماخوذ از رسالہ تاریخ ادب اردو:ایک مطالعہ،ڈاکٹر نشاں زیدی،جلد 4 شمارہ 1۔جنوری تا مارچ 2022،ص: 119)

جہاں اس رسالے کی ترقی و کامرانی میں نگراں اور مدیر کی رہنمائی و کاوش معنی رکھتی ہے وہیں دیگر عوامل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ ایڈیٹوریل ممبران کی محنت و جانفشانی بھی قابل ستائش ہے۔رسالے کے لیے مضامین کے انتخاب سے لے کر پروف ریڈینگ،مضامین کی ترتیب اور اس کی تزئین و آرائش تک کے تمام مراحل بحسن وخوبی انجام دیے گئے ہیں۔لہذا بہت کم عرصے میں یہ رسالہ قارئین ادب کی توجہ کا مرکز بن گیا اور صف اول کے جرائد میں شمار ہونے لگا،جس کا بذات خود ''تاریخ ادب اردو'' کا ہر شمارہ بین ثبوت ہے۔

زیر مطالعہ تحریر رسالہ سہ ماہی ''تاریخ ادب اردو'' کی جلد 3- شمارہ 1 (جنوری تا مارچ 2021) کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔اس شمارے میں متفرق و متنوع موضوعات و مسائل کو محیط کل آٹھ مضامین شامل ہیں ۔سرفہرست اس جریدے کے مدیر پروفیسر محمد یحیٰ صبا کا مضمون بعنوان ''فرحت روح کا شاعر:اصغر گونڈوی'' ہے۔مضمون کی قرات سے واضح ہوتا ہے کہ پروفیسر یحیٰ صبا نے اس ایک مضمون میں اصغر گونڈوی کی پیدائش سے لیکر تعلیم و تربیت،شاعری سے شغف، ملازمت،حیات و خدمات اور ایک پختہ شاعر بننے تک کے تمام مدارج کا احاطہ کیا ہے۔نیز اصغر گونڈوی کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی پیش کیا ہے۔اردو شاعری میں اصغر گونڈوی کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے۔ان کا شمار اردو کے صوفی شعراء(میر درد،سراج اورنگ آبادی اور امیر مینائی) میں ہوتا ہے۔اصغر گونڈوی کی پیدائش تو لکھنؤ میں ہوئی لیکن والد کی ملازمت و رہائش گونڈہ میں ہونے کے سبب یہ بھی وہیں رہے۔اردو شاعری میں اصغر' گونڈوی' کے نام سے شہرت حاصل کی۔ان کے کلام کے دو مجموعے ''نشاط روح'' اور'' سرود زندگی'' ان کا کل سرمایۂ حیات ہے۔

پروفیسر یحیٰ نے اصغر گونڈوی کو دوسرے صوفی شعراء سے مختلف قرار دیا ہے، وہ اس طور پر کہ ان کے کلام میں جو حزن وملال اور یاس کی کیفیت ہے اس کا سبب ان کے فلسفیانہ مزاج کو بتایا ہے۔ انہوں نے روایتی حسن وعشق کی شاعری سے گریز کرتے ہوئے اپنا ایک مختلف رنگ وآہنگ متعین کیا۔ پروفیسر یحیٰ نے اپنے مضمون میں اصغر گونڈوی کے شاعرانہ اوصاف اور دیگر شعراء سے ان کے مزاج کی انفرادیت کو اس طرح واضح کیا ہے:

> اصغر گونڈوی اردو کے ان چنندہ شاعروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے حسن و عشق کی شاعری کو محض ہجر کی نالہ وزاری، جسم کی لطافتوں اور لذتوں کے بیان یا اس سوز وگداز سے جو عشقیہ شاعری کا لازمہ سمجھا جاتا ہے، دور رکھ کر اک نشاطیہ اور طربیہ لب ولہجہ دیا جو بالکل نیا تھا اور جو پڑھنے والے کو اداس یا غمگین کرنے کی بجائے ایک مسرت افزا کیفیت سے دوچار کرتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں لکھنوی شاعری کے اوچھے پن یا تہذیب سے گری ہوئی کسی بات کا شائبہ تک نہیں۔ اصغر کی شاعری اصلاً تصوف کی شاعری ہونے کے باوجود دوسرے صوفی شاعروں مثلاً درد، سراج اورنگ آبادی یا امیر مینائی کی شاعری سے بہت مختلف ہے اور وہ اس طرح کی ان کی شاعری اس شخص کو بھی جسے تصوف یا صوفیانہ مضامین سے کوئی دلچسپی نہ ہو، سرشار اور محظوظ کرتی ہے، ان کا پیرایۂ بیان دلکش، رنگین اور مسرت افزا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان کو دوسرے صوفی شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

پروفیسر یحیٰ رمز جمالیات کو اصغر کے کلام کا خاص وصف قرار دیتے ہیں۔ وہ حسن وعشق کے ناز و نیاز کے نہیں بلکہ ان کی باہمی کشش پر زور دیتے ہیں اور عشق میں بھی نظارہ جمال کر سکتے ہیں۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں پروفیسر یحیٰ نے ان کے کلام کے متعدد اشعار پیش کیے ہیں۔ مثلاً یہ شعر۔

دید کیا نظارہ کیا اس کی تجلی گاہ میں
وہ بھی موج حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں

☆

عشق تھا آپ مشتعل حسن تھا خود نمود پر
میری نظر سے کیا ہوا تیری نظر نے کیا کیا

پروفیسر تحیٰ نے اصغر گونڈوی کے کلام کی شاعرانہ خصوصیات کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان کے کلام میں خیالات کی یکسانیت، یک رنگی وہمواری ہے جو دوسرے غزل گوشعراء کے یہاں موجودنہیں ۔ایک یہ کہ عشقیہ شاعری کے فرسودہ عاشق کی طرح وہ کبھی محبوب کی منت وسماجت کرتے یا اس کے در پر سربہ سجدہ نظرنہیں آتے ۔ دوسرے یہ کہ ان کے یہاں ناکامیٔ محبت، رقیب سے حسد ورشک اورمحبوب کی بے توجہی جیسے عناصر ناپید ہیں ۔ بلکہ ایک طرح کی انا وخودداری اور عظمت عشق کا جذبہ موجزن رہتا ہے ۔اصغر کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ انہوں نے پیش پا افتادہ مضامین سے علی العلوم گریز کیا ہے۔یعنی اپنے خاص اورمنفرد انداز بیان اورلطیف پیرایۂ اظہار سے اپنے کلام میں جدت پیدا کی ہے۔ پروفیسر تحیٰ نے اپنے خیال کی توثیق میں ڈاکٹر اعجاز حسین اورراجندر ناتھ شیدا کے اقتباسات بطور حوالہ پیش کیے ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر تحیٰ صبا کا یہ مضمون اصغر گونڈوی کے شاعرانہ اوصاف اور شعری خصوصیات کے حوالے سے بہت اہم ہے۔جوایک ادبی قاری کی معلومات میں اضافہ کرنے کا باعث بنے گا۔نیز قارئین ادب میں اصغر گونڈوی کو پڑھنے اوران کے کلام کی تفہیم کا جذبہ پیدا کرے گا۔

رسالے کا دوسرا مضمون'' جہانِ نو کی تسخیر کا نسخۂ کیمیا'' ڈاکٹر محمد نظام الدین کا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر علامہ اقبال کی مشہور زمانہ نظم '' خضرراہ'' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔علامہ اقبال کے نام سے کون واقف نہیں!ان کا شہرہ صرف اردو دنیا میں ہی نہیں بلکہ تمام عالم میں ان کا نام ہر خاص وعام کی زبان پر رواں ہے۔ان کی شخصیت وحیثیت کئی اعتبار سے مسلم ہے۔ وہ شاعرومفکر اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کے ہمدرد،نوجوان نسل کے مستقبل کے معمار،تسخیر کائنات کے رازداں اورسوئے ہوئے جسموں میں انقلابی روح پھونکنے والے مسیحا ہیں۔ان کے ذکر کے بغیر سارا اردو ادب تشنہ لب اور نامکمل رہے گا۔ڈاکٹر نظام الدین نے اس نظم میں علامہ اقبال کے پوشیدہ پیغام اورانقلابی فکر سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے ۔انہوں نے نظم کے اس مصرعے '' اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' کو بطور خاص مرکز توجہ بنایا ہے۔ یہ مصرع اپنے آپ

میں ایک جہانِ معنی کو سمیٹے ہوئے ہے۔اس کے ذریعہ اقبال نوجوان نسل کو جہد مسلسل ،عمل پیہم ،خود مکتفی بننے اور تسخیر کائنات کی ترغیب دیتے ہیں ۔ڈاکٹر نظام الدین نے اس نظم بالخصوص مذکورہ مصرع کے پس پردہ کارفرما اقبال کی فکر کو گرفت میں لاتے ہوئے لکھا ہے:

> یہ مصرع اقبال کے دل ودماغ سے اس وقت نکلا تھا جب نہ صرف عالم اسلام بلکہ تمام ایشیائی اقوام کے لیے نازک ترین اور پرآشوب دور تھا۔مغربی قوتیں اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی بنیاد پر امن عالم کے لیے ایک چیلنج بن چکی تھیں۔آج کے دور میں اس مصرع کی معنویت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ پوری مغربی دنیا کی شاطرانہ نگاہیں مشرق وسطیٰ پر مرکوز ہیں اور اپنے مفاد کی خاطر آپسی خانہ جنگی کے لیے سازشیں رچ رہی ہیں۔مسلم قوم اور مشرق وسطیٰ کی بدترین صورتحال اقبال کے دور میں بھی تھی اور آج بھی مسلم قوم اور مشرق وسطیٰ کے حالات سنگین ہیں۔

اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کی عصری معنویت آج بھی مسلم ہے۔عصر حاضر میں اس کی اہمیت و معنویت یوں بڑھ جاتی ہے کہ قوم وملت کے حالات آج بھی ناگفتہ بہ ہیں ،جیسے کہ قابال کے عہد میں تھے۔جب بھی انھیں سوئے ہوئے اذہان کو جھنجھوڑنے کے لیے ایک شعلہ انگیز اور ولولہ خیز فکر پر مبنی کلام کی ضرورت تھی۔گرچہ آج ہم نے کارہائے زندگی میں بے شمار ترقیاں حاصل کر لی ہیں لیکن ہمارے حالات میں آج بھی تشویش ناک ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اب بھی ہمیں اقبال کے کلام و پیغام کی اشد ضرورت ہے۔اسی عصری ضرورت کے تحت ڈاکٹر نظام الدین نے اقبال کی اس نظم کو بطور موضوع منتخب کیا ہے،اور تمام نوجوان نسل اور دانشوران قوم کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کی کوشش کی ہے تا کہ ہمارے اندر حرکت عمل پیدا ہو اور ہم اپنے سنہرے ماضی اور عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے کوشاں ہو جائیں۔جیسا کہ اقبال خود کہتے ہیں ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

یا جیسے نظم ''خضر راہ'' کا یہ شعر ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

مجموعی طور پر ڈاکٹر نظام الدین کا یہ مضمون قابل ستائش ہے اور قارئین ادب اور نو جوانوں کے لیے کار آمد ہے۔اس سے قطع نظر جہاں ڈاکٹر نظام نے اقبال کا نمونۂ کلام پیش کیا ہے اس میں ایک دو جگہ پر ان سے سہو قلم ہو گیا ہے یا ٹائپنگ کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔جیسے ان کے مضمون میں درج ہے ۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم
آب اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنی جہاں پیدا کرے

جبکہ اس کا درست متن اس طرح ہے ۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

پھونک ڈالے یہ زمین و آسماں مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پید اکرے

رسالے کا تیسرا مضمون ڈاکٹر شیریں فاطمہ کا ''کورونا وائرس :ایک مضر اور مہلک وبا'' سے معنون ہے ۔یہ طبی، سائنسی اور حفظان صحت کے اعتبار سے انتہائی معلوماتی اور تحقیقی مضمون ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر شیریں فاطمہ نے عالمی سطح پر پھیلنے والی مہلک وبا ''کورونا وائرس'' کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔کورونا وبا کیا ہے؟،اس کی علامات کیا ہیں؟اس کے پھیلنے کی اصل وجوہات، کسی شخص کو کورونا ہونے کے اسباب،اس کی جانچ کے طریقۂ کار،اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر، اس کی روک تھام کے لیے ملکی و غیر ملکی سطح پر لاک ڈاؤن کا نفاذ،لاک ڈاؤن اور وبا سے متاثر تمام شعبہ ہائے زندگی غرض ہر Aspect پر انہوں نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔کورونا ایک ایسی مضر وبا ہے جس کا نام سنتے ہی ہر فرد بد کنے لگتا ہے۔اس نے لوگوں کے ذہن و دل میں ایسی ہیبت طاری کر دی کہ وہ بیماری سے کم بلکہ خوف سے زیادہ مرنے لگے۔ڈاکٹر شیریں نے لکھا ہے کہ:

کورونا ایک ایسی وبا ہے جس کا نام سنتے سنتے ہم تھک گئے ہیں، لیکن یہ وبا ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ ایک شہر نہیں، ایک ملک نہیں یہ تیزی سے پوری دنیا میں پھیلتی چلی گئی اور پوری دنیا پر اثر انداز ہوگئی۔ اس نے صرف انسانی جسموں کو ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ دلوں میں موت کا خوف ایسے بھر دیا کہ انسان انسان سے ڈرنے لگا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے دوریاں بڑھانے لگا، چیزوں کو چھونے میں ڈرنے لگا، سفر کرنے میں ڈرنے لگا۔ حتیٰ کہ گھر سے باہر نکلنے میں بھی ڈرنے لگا۔ اس وبا نے بازاروں کی رونقیں چھین لیں، شہر شہر کے ویران کر دیئے۔ چاروں طرف صرف سناٹا پسرنے لگا۔ کئی زندگیاں اس نے لے لیں۔ کوئی بیماری سے مر گیا تو کوئی خوف سے، لاکھوں گھر اس نے تباہ کر دیئے۔

کورونا وائرس نے نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر معاشی، سیاسی، تعلیمی شعبوں کو بے حد متاثر کیا، ملکوں کے آپسی تعلقات میں دراریں پیدا ہوگئیں۔ ہر ملک دوسرے ملک کو اس وبا کے لیے موردِ الزام ٹھہرانے لگا۔ ہر ملک نے لوگوں کی ادھر سے ادھر آوا جاہی پر پابندی عائد کر دی۔ اس عالمی وبا نے مزدور اور غریب طبقہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا، ان کے حالات مزید ناگفتہ بہ اور بدتر ہوگئے۔ فاقہ کشی سے مجبور و بے بس ہو کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوگئے۔

تعلیمی میدان میں کورونا کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی تعلیم ایک بڑے بحران کا شکار ہوئی ہے۔ ڈاکٹر شیریں نے لکھا ہے کہ ''دنیا کے تقریباً ۱۸۸ ممالک نے اپنے یہاں اسکول بند کر رکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی وجہ سے دنیا بھر میں تقریباً ۱۵۰ کروڑ بچوں کی اسکولی تعلیم درہم برہم ہوگئی ہے۔'' لیکن بہت سے ترقی یافتہ ممالک نے اس کے حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے فاصلاتی تعلیمی پروگرام شروع کر دیئے ہیں۔ غرض کہ ڈاکٹر شیریں کا یہ مضمون بہت مفید اور معلوماتی ہے۔ انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی اور دیدہ ریزی سے مواد اکٹھا کر کے کارآمد باتوں کو ضبط تحریر میں لیا ہے۔

رسالے کا ایک اور اہم مضمون محمد امان اللہ خان کا ''پس نوآبادیاتی تنقید اور فرانز فینن''

پر مشتمل ہے۔ پس نو آبادیاتی تنقید ایک ایسا موضوع ہے جس سے اکثر اہل قلم بالخصوص اردو داں طبقہ گریز پا رہتا ہے اور جو حضرات لکھتے بھی ہیں تو چھچھلتی سی نظر ڈال کر گزر جاتے ہی ہیں۔ محمد امان اللہ نے اس موضوع کو منتخب کرنے کا حوصلہ کیا، یہ اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ محمد امان اللہ نے اس مضمون میں پس نو آبادیات کا معنی و مفہوم، اس نظام کی ابتدا، پس نو آبادیات کے ضمن میں مستعمل اصطلاحیں اور اس نظام کا عالمی سطح پر عمل دخل جیسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بہت ہی آسان الفاظ میں پس نو آبادیات کا مطلب واضح کیا ہے۔ محمد امان اللہ لکھتے ہیں:

نو آبادیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقتور ریاست اور قوم کسی کمزور ریاست اور قوم کو اپنے مفاد کی خاطر اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔ قابض ریاست کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر قدرتی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی وسائل کے ساتھ ساتھ افرادی قوت اور تجارتی منڈیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی غلبہ کی بنا پر قابض ریاست اپنی اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کو فروغ دیتی ہے۔ نہ صرف اقتصادی و معاشرتی شعبے بلکہ حکومتی انتظام چلانے والے تمام ادارے بھی قابض ریاست کے دائرہ اختیار میں آجاتے ہیں۔ یوں قابض ریاست اپنی اس نو آبادی پر مکمل اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام ایک اصطلاح کے طور پر مستعمل ہے۔

یورپی نو آبادیاتی نظام کی باقاعدہ ابتدا سولھویں صدی عیسوی سے ہوئی اور اٹھارویں صدی عیسوی تک اس نظام نے تشکیلی مدارج عبور کر کے مضبوطی حاصل کر لی۔ محمد امان اللہ نے مختلف لغات اور ڈکشنریوں کے توسط سے نو آبادیات (Colonialism) کے مفاہیم واضح کیے ہیں اور نو آبادیاتی نظام تصور کی دو اہم بنیادوں کے بارے میں بتایا ہے۔ ایک یہ کہ" ہم بہتر ہیں لہٰذا خدا ہمارے ساتھ ہے۔" دوسرا" ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں اس لیے غلاموں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔" جن مفکرین اور دانشوروں نے پس نو آبادیاتی مطالعہ اور اس کے ذیل میں مستعمل تصورات و نظریات پر قلم اٹھایا ہے ان میں جوزف کونارڈ، ایڈورڈ سعید اور فرانز فینین بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ محمد امان اللہ نے ایڈورڈ سعید اور فینین کی نو آبادیاتی نظریات پر مشتمل اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ استعماری اور سامراجی نظام کو ان دونوں حضرات نے کس طرح سمجھا اور پرکھا ہے محمد امان اللہ نے ان کی کتابوں کے ذریعہ ان کے نظریات و تصورات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں فینین کی پہلی کتاب Peau Noire Masques Blancs

(۱۹۵۲) ہےاس کا انگریزی ترجمہ Black skin white masks کے نام سے کیا گیا۔ یہ کتاب افریقی نسل کے محکوم باشندوں کی نفسیات پر نوآبادکاروں کی طرف سے مرتب ہونے والے منفی اثرات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے ۔ محمد امان اللہ نے فینن کی دوسری اہم کتاب A Colonialism Dying (Ancique L) کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کتاب میں مقامی باشندوں اور حاکم نوآبادکاروں کے درمیان باہمی کش مکش کو بیان کیا گیا ہے۔فینن کی ایک اورمشہور کتاب The Wretched of the Earth ہے جس کا ترجمہ سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز نے کیا ہے۔محمد امان اللہ نے بتایا ہے کہ فینن نے اس کتاب کے ذریعہ علمی دنیا میں استعماریت اور سامراجیت کا اصل چہرہ بےنقاب کیا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کے بڑھتے مظالم ،تشدد اور استحصال کے خلاف ردعمل کے طور پر ساری دنیا میں آوازیں اٹھائی گئیں ۔ یہاں تک کہ عالمی سطح پر ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے ۔ اس نظام کے خلاف بہت سا احتجاجی ادب وجود میں آیا۔اردو شعراء وادباء بھی کمر بستہ ہوکر اس کی جانب متوجہ ہوئے ۔محمد امان اللہ نے اپنے اس مضمون میں ان تمام شاعروں اور ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اس نظام کے خلاف لکھا۔نیز اردو تنقید میں جن نقاد نے اردو شعروادب کی تنقید وتفہیم اس نظریہ کے تحت کی ان کا بھی احاطہ کیا ہے۔غرض کہ محمد امان اللہ کا پس نوآبادیاتی تنقید پر مبنی یہ مضمون نئے پڑھنے والوں کے لیے ضرور مفید ثابت ہوگا۔

تاریخ ادب اردو کے اس شمارے کا پانچواں مضمون چھوٹو لال کا ''رفیعی اجمیری :ایک جواں مرگ افسانہ نگار'' کے عنوان سے ہے۔رسالہ تاریخ ادب اردو کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اسس میں ان موضوعات اور شخصیات کو بھی ترجیح دی جاتی ہے جن کے فن اور ادبی خدمات پر توجہ نہیں دی گئی ،ایک عام قاری تک جس سے واقف نہیں ہوتا ۔ چھوٹو لال نے رفیعی اجمیری کا موضوع منتخب کر کے تمام قارئین کو ان کی افسانہ نگاری سے متعارف کرایا ہے۔

چھوٹو لال کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اجمیر بھی اردو افسانہ نگاری کے لیے جانا جاتا ہے ۔ یہاں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو افسانہ نگاری اپنے عروج پر تھی ۔اس دور میں جن افسانہ نگاروں کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں ان میں حیدر اجمیری ،رفیعی اجمیری ،قیسی

رامپوری، محمودالحسن بہارکوٹی عبیداللہ قدسی عرفان فضائی اور معین زلفی اہمیت کے حامل ہیں۔ رفیعی اجمیری کا شمار راجستھان کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ چھوٹو لال نے رفیعی اجمیری کی حیات پر مختصر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ رفیعی اجمیری کا اصل نام رفیع الدین صدیقی تھا۔ یہ اجمیر میں ۱۹۰۹ میں پیدا ہوئے اور عین جوانی میں ۱۹۳۹ میں اس جہان فانی سے گزر گئے۔ تیس سال کی قلیل عمر میں انہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کا تعلق رومانوی دور سے ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''کہکشاں'' ۱۹۴۳ میں ساقی بک ڈپو دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ جو تیس افسانوں اور چار ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔ چھوٹو لال نے رفیعی اجمیری کی ادبی حیثیت اور افسانہ نگاری کو واضح کرنے کے لیے ان کے ہم عصروں اور دیگر اہم شخصیات کے اقوال اور اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔ رفیعی اجمیری کے افسانوں کی بنیاد اور مزاج حسن وعشق اور عنفوان شباب کے مچلتے جذبات پر ہے۔ رجستھان میں اردو افسانہ نگاری کو مقبول بنانے میں ان کا اہم رول ہے۔

ریسرچ اسکالر سلطانہ فاطمہ انصاری کا مضمون ''مختار ٹونکی: بحیثیت طنز و مزاح نگار'' بھی توجہ کا حامل ہے۔ مختار ٹونکی کا شمار اردو کے اہم طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ابتدا سے ہی اردو ادب میں طنز ومزاح کے نقوش ملتے ہیں۔ لیکن اس صنف کو پروان چڑھانے میں پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی، کنھیالال کپور، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد یوسفی نے اہم کردار ادا کیا۔

سلطانہ فاطمہ کے مضمون کی قرأت سے انکشاف ہوتا ہے کہ مختار ٹونکی کا تعلق ٹونک سے ہے۔ یہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کے اب تک پانچ مجموعے ''اوٹ پٹانگ''، ''لغویات''، ''خرافات''، ''مزخرافات'' اور ''ہفوات'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مختار ٹونکی کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے طنز ومزاح اور انشائیوں کو باہم آمیز کر کے ایک نئی صنف ''طنشائیہ'' ایجاد کی ہے۔ انہوں نے اپنے طنز کو انشائیہ کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کیا ہے یہی خوبی انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سلطانہ فاطمہ نے بطور نمونہ مختار ٹونکی کی کتابوں سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔ جو مختار ٹونکی کے انداز بیان اور اسلوب نگارش پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> یہ پیٹ ہی تو ہے جو اتاشی کو بھی راشی بنا دیتا ہے اور نادار کو زردار کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ عورت اپنی حرمت وعصمت بیچتی ہے تو پیٹ کی خاطر

۔۔۔آپ ہمیں بتائیں کہ لوگ قومی سطح پر بھکاری کیوں بنے ہوئے ہیں اور
ہمیں سمجھائیں کہ کچھ لوگ بین الاقوامی سطح پر کھلاڑی کیوں بنے ہوئے ہیں۔
یہ چیریٹی چندہ وندہ کیا ہے؟ سب پیٹ کا گورکھ دھندہ ہے۔ یہ نذرانہ چڑھاوا
کیا ہے۔ پیٹ و پلیٹ کا بلاوہ ہے۔

مختار ٹونکی نے نہ صرف طنزیہ تیر چلائے ہیں بلکہ ایک طبیب کی حیثیت سے سماجی برائیوں کا سدباب بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں سلطانہ فاطمہ لکھتی ہیں ''مختار ٹونکی ایک طبیب کی مانند ہیں۔ جو ہمارے معاشرے اور عوام میں موجود نفرت اور اختلاف کو درست کرنے کے لیے قلم کو نشتر بنا کر جراحی کا کام لیتے ہیں۔'' حاصل کلام یہ ہے کہ سلطانہ فاطمہ کا مضمون مختار ٹونکی کے طرز نگارش اور زبان و انداز پر ایک علمی مضمون ہے۔

''ڈاکٹر ترنم ریاض: شخصیت اور شاعری'' ریسرچ اسکالر رائلہ فاطمہ انصاری کا لکھا ہوا مضمون ہے۔اردو شعر و ادب میں جہاں مرد حضرات نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں وہیں خواتین نے بھی تخلیقی ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔اور وقفہ وقفہ سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہیں، جن کی فہرست سازی یہاں ممکن نہیں۔ رائلہ فاطمہ کی تحریر سے جو نکات برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ بیسویں صدی کے بعد سے شاعرات کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔جن میں ترنم ریاض کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ترنم ریاض کا شمار جدید دور کی اہم شاعرات میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت ناول و افسانہ نگار، شاعرہ، تنقید نگار اور ترجمہ نگار ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن کے نام یہ ہیں: ''پرانی کتابوں کی خوشبو''، ''بھادوں کے چاند تلے''، ''زیرِ سبزہ محوِ خواب'' ترنم ریاض کے شعری موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے رائلہ نے لکھا ہے کہ ''وہ اپنی شاعری کے موضوعات اور عنوانات میں اکثر عورتوں، بچوں، پرندے، موسم اور موجودہ واقعات وغیرہ کی دلکش فضا بنتی ہیں اور یہ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت بھی ہے۔'' ترنم ریاض کے کلام میں ہر قسم کے جذبہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ خواہ نفرت ہو یا محبت، غم ہو یا خوشی، وقت و حالات کی ستم ظریفی یا حسن و عشق کے دلفریب قصے۔ ترنم ریاض کی شاعری ان کے تجربات و محسوسات کی بہترین عکاس ہے، نیز عہد حاضر کی ترجمان بھی ہے۔رائلہ فاطمہ نے بطور نمونہ ان کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً

یہ کس نے بوئی ہیں چنگاریاں تیری زمینوں میں یہ کس نے آگ سی سلگائی ہے

معصوم مینوں میں کوئی ویران موسم آبسا بارہ مہینوں میں کہ جیسے ہوں نہ تاثیریں ہی اب جھلکتی جبینوں میں کسی نے باغباں بن کر جلایا مرغزاروں کو کسی نے بائباں بن کر اجاڑا بہاروں کو مضمون نگار نے ترنم ریاض کے تینوں شعری مجموعوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ان کی زبان سادگی اور تازگی لیے ہوئے ہے۔ان کی ایک شعری خوبی دلکش فضا آفرینی ہے۔

رسالے میں شخصی، شعری، معلوماتی موضوعات ومضامین کے ساتھ ساتھ تہذیبی واخلاقی موضوعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ رسالے کا آخری مضمون ڈاکٹر واثق الخیر کا لکھا ہوا ''تہذیبی واخلاقی اقدار کا بحران اور اردو ناول'' ہے۔ان کا یہ مضمون تہذیبی واخلاقی اقدار کی تفہیم وتعبیر اور زوال کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔اس میں انھوں نے تہذیب کی تعریف اور کسی بھی قوم کے لیے اس کی اہمیت و معنویت پر زور دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

تہذیب وسیع ترین ثقافتی اکائی کا نام ہے۔یہ نام ہے اقدار کے ہم آہنگ وشعور کا، جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔جسے افراد اپنے جذبات، رجحانات، اپنے برتاؤ اور اثرات میں ظاہر کرتے ہیں، ہر معاشرہ بالعموم ان قدروں کو اپنی جان، مال اور جائیداد سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ان تہذیبی قدروں کے لیے کسی قوم میں بڑی جذباتیت ہوتی ہے۔ہر قوم مختلف اشیاء، عقائد، خیالات اور دیگر تہذیبی قدروں کو اپنے اقدار کی کسوٹی پر پرکھتا ہے جو قدریں، جو چیزیں اس کسوٹی پر پورا اتریں وہ قبول کرلی جاتی ہیں۔ان قدروں کی بنیاد معاشرے میں، زمین ہی میں موجود رہتی ہیں۔نہ یہ جبراً نافذ کی جاتی ہیں نہ آسمان سے اترتی ہیں بلکہ ان کے پس پشت صدیوں کے تاریخی رواج کارفرما ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر واثق الخیر نے ہندوستانی تہذیب وثقافت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ہمارے ملک کی تہذیبی اقدار وروایات کس طرح معرض وجود میں آئیں اور کون کون سے عوامل وعناصر کارفرما رہے۔انھوں نے ہندوستان کی سنہری تہذیب اور اخلاقی اقدار کو اردو کے مشہور ومعروف ناولوں کے توسط سے اجاگر کیا ہے، پھر کس طرح وہ قدریں زوال پذیر ہوئیں اس کی تمام روداد اردو ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں

بڑی دردمندی سے پیش کی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر واثق الخیر نے احسن فاروقی کے ناول ''شام اودھ''، قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے''، عصمت چغتائی کے ناول ''معصومہ''، ''ٹیڑھی لکیر'' اور عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' وغیرہ سے بطور خاص بحث کی ہے۔عصر حاضر میں ہمارے ملک کی تہذیب ومعاشرت اور اخلاقی اقدار کہاں تک محفوظ ہیں اور کن کن ذرائع سے یہ بحران کا شکار ہوئیں؟ اس ضمن میں دور جدید کے ناولوں کا تذکرہ کیا ہے۔جن میں اقبال مجید کا ناول ''نمک''، حسین الحق کا ناول ''فرات''، علی امام نقوی کا ''تین بتی کے راما''، عبدالصمد کا ''دھمک'' اور مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' وغیرہ اہم ہیں۔مذکورہ تمام ناولوں میں کم وبیش ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کا زوال، اخلاقی پستی، مشرقی ومغربی تہذیبوں کا باہمی تصادم، قدیم تہذیبی واخلاقی قدروں کو درپیش چیلنجز، مشینی وسائنسی ایجادات کے منفی اثرات، جنسی بے راہ روی وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔موجودہ صورتحال کو سمجھنے کے لیے آج کے طلبا اور قارئین کے لیے ڈاکٹر واثق الخیر کا یہ مقالہ بے حد معاون ومددگار ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رسالہ ''تاریخ ادب اردو'' کے اس شمارے میں شامل تمام مضامین اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس مجلّہ نے کیوں کر اتنے کم عرصے میں اپنی حیثیت کو منوا کر یو جی سی کیئر لسٹ میں جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔علمی، معلوماتی، ادبی اور تنقیدی مضامین پر مبنی یہ جریدہ قارئین ادب بالخصوص طلباء اور ریسرچ اسکالرز کی ذہنی فکر کو مہمیز لگانے میں معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆☆☆